



اُردو افسانے کی اسلوبیاتی روایت (تناظرات وامکانات)

Stylistic Approach of Urdu Short stories (Historical Background and Possibilities)

Kashif Irfan*

Abstract

This article is about urdu fiction writing. The article covers the histological and philosophical back ground of different styles in urdu short. Story writing. It also covers different time periods of popular styles and narrates this writing styles of pioneers of some popular styles. It's also shows the literary work of some popular urdu fiction writers. The article is a brief history of short story and it also tells about future stylistic approaches in the field of urdu short stories. This article narrates significant work of prominent short stories writers and shows the different styles of short stories writers in specified way. Romanticism, realism and symbolism are the major parts of short stories writing. This article cover all this aspects.

Keywords: Stylistic, short stories, background, possibilities, fiction, romanticism, realism, symbolism

کہانی کہنے اور سننے کی روایت برصغیر میں زمانہ قدیم سے موجود ہے۔ رگ وید، مہابھارت، پنج تنز اور شاستر کی کہانیاں اسی روایت کی بنیاد ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں یہ روایت مسلسل ارتقا پذیر رہی۔ مسلمانوں کی دور حکومت میں عربی اور فارسی کی داستانی روایت کو فروغ ملا اور عرب، ہندی روایت کے ملاپ سے کہانی کی نئی صورتیں سامنے آئیں۔ یہ عمل مختلف تہذیبوں کے ادغام سے وقوع پذیر ہوا۔ ہندی زبان سے یہ روایت اُردو زبان میں منتقل ہوئی۔ اُردو میں داستان نویسی کا رواج دکن میں سب رس (۱۶۳۵ء) سے ہوتا ہے لیکن داستان کی مقبولیت نو طرز مرصع (۱۷۷۵ء) سے ہوئی۔ داستان بنیادی طور پر حیات و کائنات کے متنوع مسائل، تلاش و جستجو اور حیرت و تجسس کی قصہ در قصہ واقعات پر مشتمل کہانی ہے جس میں مافوق الفطرت کرداروں کی مدد سے نیکی اور بدی کے درمیان امتیاز پیدا کیا جاتا ہے۔

داستانیں دور قدیم کے انسان کو سوچ اور عمل کی عکاسی کرتی تھیں۔ اُردو میں داستان نگاری کا احیا فورٹ ولیم کالج کی تحریک سے ہوا۔ سرکار انگلشیہ تعلیمی مقاصد کے حوالے سے اُردو میں آسان نثر کو رواج دینا چاہتی تھی جس کے باعث ایسی کتابیں لکھوائی گئیں جو سادہ اور عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی تھیں۔ فورٹ ولیم کالج کی تحریک اُردو افسانے کا نقطہ آغاز سمجھی جاسکتی ہے۔ ان میں سب سے اہم نثری تصنیف میرامن کی ”باغ و بہار“ تھی جو فارسی سے ترجمہ ہونے کے باوجود جدید عہد سے بھی اپنا تعلق استوار کرتی تھی اور اس عہد کا معاشرتی احساس ”باغ و بہار“ میں موجود تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے سربراہ گل کر سٹ نے ایک جگہ کہا تھا: ”ابھی ہندوستانی نثر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں ہے جو قدر و قیمت یا صحت کے اعتبار سے اس قابل ہو کہ میں اپنے شاگردوں کو پڑھنے کے لیے دے سکوں۔ کسی ایسی جگہ سے شہد نکالنا میرے بس کی بات نہیں ہے جہاں کھبیوں کا کوئی چھتہ ہی نہ ہو۔“^(۱)

اُردو افسانے کا آغاز اُردو ناول نگاری کے نتیجے میں ہوا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول اُردو ادب میں انیسویں صدی کے نصف آخر میں سامنے آئے۔ اولین اُردو افسانہ نگاروں میں رومانی تحریک کے زیر اثر لکھنے والے افسانہ نگار سید سجاد حیدر یلدرم، علامہ راشد الخیری، نیاز فتح پوری، پریم چند، وزارت علی اور بی، سلطان حیدر جوش، حکیم یوسف حسن اور دردمند اکبر آبادی کے نام سامنے آتے ہیں۔ اُردو افسانہ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں لکھا جانے لگا اور مختلف ادبی جرائد میں اس کی اشاعت شروع

* Research Scholar (Ph.D, Urdu) Allama Iqbal Open University, Islamabad.

Email: kashifirfan787@gmail.com, kashifirfan72@hotmail.com

Orcid ID. Kashif irfan <https://orcid.org/0000-0002-0028-2234>

ہوئی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں مشرق پر مغرب کی مختلف تحریکیں اثر انداز ہو رہی تھیں۔ سوشل ازم، اسٹھٹیک ازم اور امپریل ازم کے ساتھ ساتھ سر نیلزم بھی سامنے آئیں۔ اُردو افسانے کے ابتدائی نقوش کی تلاش ہمارے بہت اہم نقادوں نے کی۔ ان میں وقار عظیم کا کام بنیادی نوعیت کا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ محمد حسین آزاد کی ”نیرنگ خیال“ اور میر ناصر علی ”صلائے عام“ میں شائع ہونے والی تمثیلات، مختصر افسانے کے ابتدائی نقوش ہیں۔ ان کا انداز شاعرانہ اور تمثیلی ہوتا تھا۔ یہ افسانے تو نہ تھے تاہم یہ افسانے کے ابتدائی نقوش سمجھے جاسکتے تھے۔ اُردو افسانہ نگاری کی بنیاد رومان نگاروں کے ہاتھوں پڑی۔ ان میں راشد الخیری کو اُردو کا پہلا افسانہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے اور ان کا پہلا افسانہ ”نصیر اور خدیجہ“ ہے جو ”مخزن“ لاہور دسمبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا۔ سجاد حیدر یلدرم، علامہ راشد الخیری، نیاز فتح پوری اور پریم چند کے ہاں فن کی سطح پر جدت طرازی بھی نظر آتی ہے۔ علامہ راشد الخیری کا پہلا افسانہ ”نصیر اور خدیجہ“ ہے جو خط کی تکنیک میں لکھا گیا جو اُردو افسانے میں ایک نئی تکنیک تھی۔ ان افسانہ نگاروں کے ہاں روایت پسندی اور جدت طرازی کا وہ امتزاج نظر آتا ہے جس نے آگے چل کر ”انگارے“ کی تحریک پیدا کی۔ اُردو افسانے میں رومانی طرزِ تحریر کے سب سے اہم فنکار سید سجاد حیدر یلدرم (۱۹۳۳ء-۱۸۸۰ء) تھے۔ ان کے ہاں حقیقی، مقصدی اور اصلاح سوچ کے ساتھ ساتھ خالص رومانی افسانے بھی ملتے ہیں۔ وہ ادب کو زندگی کے تلخ حقائق سے الگ رکھ کر ایک رومانی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور انھوں نے مغربی رومان پسند افسانہ نگاروں کے تتبع میں ”فن برائے فن“ کے نظریے کو فروغ دیا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ خیالستان (۱۹۱۱ء) ہے جس کے افسانوں میں فن کا احساس اور اظہار بھر پور طریقہ پر آتا ہے۔ زبان کے چٹکارے اور فن کی نزاکتوں، لطافتوں، خیال کی رعنائی، بیان کی رنگینی جیسے عناصر ان کے ہاں نمایاں نظر آتے ہیں۔ خصوصاً ”سودائے سنگین“، ”حکایت لیلیٰ مجنون“ اور ”خارستان“۔

اُردو افسانے میں حقیقت نگاری کی ابتدا پریم چند سے ہوئی۔ ان کے ہاں حقیقت نگاری کا اولین زاویہ حب وطن اور قومی یکجہتی کا ہے۔ انھوں نے افسانوں میں قومی آزادی اور مختلف عصری جذبول کو پیش کیا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ”سوز وطن“، وطن کی محبت قومی غیرت جیسے جذبات لیے ہوئے تھا۔ ان کا پہلا طبع زاد افسانہ ”عشق و نیا اور حب وطن“، قومی جذبے سے سرشار افسانہ ہے۔ ڈاکٹر نگہت ریحانہ خان لکھتی ہیں:

”منشی پریم چند کو اپنے وطن سے عشق تھا۔ وہ اس کی روایات کے محافظ تھے لیکن انھیں کلی طور پر قدامت پرست نہیں کہا جاسکتا کیونکہ جہاں وہ مغرب کی اندھا دھند تقلید کو بُرا سمجھتے تھے وہیں اس کی ہر چیز کو قبول کرنے اور اپنانے کے حق میں تھے جو ہماری زندگی کو بہتر بنانے اور اس کی ترقی میں معاون ثابت ہو سکتی تھی۔“ (۲)

پریم چند کے ہاں جذبہ حب الوطنی کے علاوہ معاشرتی تضادات بھی موضوع کی صورت میں افسانوں میں ظاہر ہوئے۔ انھوں نے دیہی زندگی کے نچلے طبقے کے کرداروں کو اپنا موضوع بنایا۔ انھوں نے اس کچلے ہوئے فرد کے مسائل کو موضوع بنایا جس پر اس سے پہلے کسی کی نظر نہ پڑی تھی۔ پریم چند کے ہاں افسانوں میں مقامی رنگ نمایاں ہوتا ہے جو ان کے افسانوں میں حقیقت اور واقعیت پیدا کر دیتا ہے۔ ان کے ہاں انسانی کرداروں کے دلکش اور مؤثر مرقعے بھی نظر آتے ہیں۔ ”نامی“ اور ”دوبیل“ جیسے افسانوں میں یہ کرداری نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے ہاں تکنیک کے تجربے بھی ملتے ہیں۔

”سوز وطن“ کے بعد ان کے دوسرے افسانوی مجموعوں میں ”پریم بچھپی“، ”پریم پتیسی“، ”خاک پروانہ“، ”خواب و خیال“، ”فردوس خیال“، ”پریم چالیسی“، ”آخری تحفہ“، ”زادراہ“، ”دودھ کی قیمت“ اور ”واردات“ شائع ہوئے۔ ان مجموعوں میں ان کا فن ارتقائی مراحل طے کرتا ہے اور ان کا موضوعاتی دائرہ وسیع بھی ہوتا ہے اور نیا رخ بھی اختیار کرتا ہے۔ پریم چند کے اکثر افسانوں میں زندگی کے تلخ اور تاریک گوشے دکھائے گئے ہیں۔ ”لاٹری“، ”مجبوری“، ”کفن“ اور ”دودھ کی قیمت“ جیسے افسانوں میں یہ رنگ غالب ہے تاہم ان کے ہاں زندگی کے خوش کن رویے بھی نمایاں ہیں۔ ”طولِ محبت“، ”عید گاہ“ اور ”زیور کا ڈبہ“ میں یہی رنگ نمایاں ہے۔

پریم چند کی حقیقت نگاری کے اثرات دور رس ثابت ہوئے۔ ان کے اثرات قبول کرنے والوں میں سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسین اور عاشق حسین بٹالوی کے نام اہم ہیں۔ ”انگارے“ اور ترقی پسند تحریک کے ادبا بھی ان کے اثرات سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔

”انگلے“ کی اشاعت افسانہ نگاری میں جذباتی ہیجان اور اضطراب کی علامت بن کر ابھری۔ پہلی جنگ عظیم میں سفاکیت اور بربریت کے مظاہروں نے انسان کا انسانیت سے ایمان ختم کر دیا تھا۔ یہ منفی اثرات اپنے ساتھ مغرب کی منفی تحریکیں بھی ساتھ لے کر آئے۔ ڈاڈا ازم ایک ایسی ہی تحریک تھی جس میں ہر چیز کے فنا ہو جانے کے رویے کی نشاندہی کی گئی تھی۔ عدم تحفظ کا احساس پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ غلامی، جہالت، اقتصادی بد حالی، بھوک اور عدم مساوات نے پورے برصغیر کے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا یہ زندگی کے ایسے مسائل تھے جن کا حل مذہب، اخلاق اور جمہوریت میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ جدید ذہن کے لیے اس ساری صورت حال میں کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ رومان پسند بھی کسی نہ کسی سطح پر مذہب اور اخلاق کے پابند تھے۔

۱۹۳۲ء میں پروفیسر محمد مجیب کا افسانوی مجموعہ ”کیمیا گر اور دوسرے افسانے“ سامنے آیا جو اُردو افسانے کو جدت سے ہمکنار کر گیا۔ ان افسانوں پر روسی افسانہ نگاروں کا اثر نمایاں نظر آتا تھا۔ اسی برس چار مختلف افسانہ نگاروں کے نو افسانوں پر مشتمل افسانوں کا مجموعہ ”انگلے“ سامنے آیا اور ضبط کر لیا گیا۔ افسانوں میں فرائیڈ، مارکس اور فرانسسی فطرت نگاروں کے اثرات موجود تھے۔ جنسی ہیجان ان افسانوں کی بنیاد تھا۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ”انگلے“ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”یہ تمام افسانے تدبیر کاری کے اعتبار سے ایمائل زولا، جمیز جوائس ڈی ایچ لارنس اور فلائیر، موضوعاتی سطح پر سگمنڈ فرائیڈ اور نظریاتی اعتبار سے مارکس اور ایننگلز کے زیر اثر تھے اور مذہب پر حملے، شدید پابندیوں کا رد عمل تھا۔“ (۳)

”انگلے“ دسمبر ۱۹۳۲ء میں نظامی پریس وکٹوریہ سٹریٹ لکھنؤ سے ایک ہزار کی تعداد میں نو افسانوں اور ایک ڈرامے پر مشتمل مجموعہ شائع ہوا۔ ۱۳۴ صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں مندرجہ ذیل افسانے اور ڈرامہ موجود تھے:

- نیند نہیں آتی سید سجاد ظہیر ص ۱۹ تا ۱۹

- جنت کی بشارت سید سجاد ظہیر ص ۲۰ تا ۳۰

- گرمیوں کی ایک رات سید سجاد ظہیر ص ۳۱ تا ۴۳

- دلاری سید سجاد ظہیر ص ۳۲ تا ۵۲

- پھر یہ ہنگامہ سید سجاد ظہیر ص ۵۳ تا ۶۷

- بادل نہیں آتے پروفیسر احمد علیص ۶۸ تا ۹۷

- مہاوٹوں کی ایک رات پروفیسر احمد علیص ۸۰ تا ۹۱

- دلی کی سیر رشید جہاں ص ۹۳ تا ۹۷

- پردے کے پیچھے (ڈرامہ) رشید جہاں ص ۹۸ تا ۱۲۰

- جو انوردی محمود الظفر ص ۱۳۱ تا ۱۳۴

محمود الظفر کا افسانہ ”جو انوردی“ بنیادی طور پر انگریزی میں لکھا گیا تھا جسے اُردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا گیا۔ انگلے میں موجود سجاد ظہیر اور احمد علی کے افسانوں کا بلب و لہجہ اس اشتغال کا باعث بنے جس کے زیر اثر مختلف شہروں میں اس مجموعے کی کاپیاں جلائی گئیں۔ ”انگلے“ اُردو افسانوں کی تاریخ کا نہایت اہم موثر ثابت ہوا۔ انتظار حسین نے نقوش ۱۹۵۵ء کے ایک مذاکرے میں کہا تھا:

”انگلے نے ایک غلط روایت کی بنیاد ڈالی۔ بعد میں آنے والوں نے سمجھا کہ افسانے میں سنسنی کی ضرورت ہے۔ تاہم احمد ندیم قاسمی کو اس رائے سے اتفاق نہ تھا اور ان کا خیال تھا کہ ”انگلے“ کی سنسنی کی روایت غلط ہے کیونکہ بعد میں آنے والوں نے اسے روایت کا جزو نہیں بنایا۔“ (۴)

”انگارے“ کے افسانوں نے ہندوستان کے سیاسی اور مذہبی حلقوں میں ہلچل پیدا کی اور ادبی اور فنی تصورات میں ایک تغیر پیدا کر دیا۔ ”انگارے“ کے افسانے ”دلاری“ اور ”نیند نہیں آتی“ نے نہ صرف نوجوان ادبا کو متاثر کیا بلکہ پریم چند کو بھی پرانی روش بدلنے اور ”کفن“ اور ”بیوی“ جیسے افسانے لکھنے پر اکسایا۔ ”انگارے“ سے متاثر ہونے والوں میں منٹو، عصمت، عزیز احمد، حسن عسکری، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں، بیدی، قاسمی اور اختر رائے پوری جیسے نام شامل ہیں۔ ”انگارے“ کے حوالے سے بے اعتدالی سنسی خیزی اور ”عدم توازن“ کی بات کی جاتی ہے۔ یہ بے اعتدالی اور عدم توازن برصغیر کی سیاسی بے اعتدالی کی علامت بن کر سامنے آتی ہے۔ اس مجموعے کی مضبوطی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسی جدوجہد اور سماجی جکڑ بندیوں کے خلاف اندر ہی اندر پلنے والی تحریک ایک نئے مرحلے تک آ پہنچی ہے۔ مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

”انگارے کی اشاعت سے حقیقت پسندانہ نقطہ نظر کو ترویج ملی۔“ (۵)

انگارے کے افسانے ایک طرف تو حقیقت نگاری کے رجحان کی توسیع ہیں۔ دوسری طرف رومانیت بھی ان میں پائی جاتی ہے۔ یہاں حقیقت نرم روئی کے بجائے طنز اور تضحیک سے عبارت ہے۔ اضطراب، ہیجان، بے چینی اور غم و غصے کی حالت میں ہر چیز کو تباہ کر دینے کا رجحان نمایاں ہے جو بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں فرانس سے اٹھنے والی تحریک ”ڈاڈا ازم“ کے رویہ سے مشابہہ نظر آتی ہے۔ جس میں غم و غصہ کی کیفیت میں ہر چیز کو تباہ کر دینے کا رویہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ان افسانوں میں مذہب، اخلاق، تہذیب و ثقافت اور روایات سب کو جبر کی مختلف صورتیں قرار دے کر ان کے خلاف نفرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ انگارے کے افسانہ نگار جدید تعلیم سے آراستہ اور بیرون ملک کی علمی و ادبی صورت حال سے بخوبی واقف تھے۔ بدلتا عالمی منظر نامہ بھی ان کی نظر میں تھا۔ اشتراکی نظریات اور مارکس ازم کے نظریات برصغیر کے تعلیم یافتہ ذہن کو تبدیل کر رہے تھے۔ اس جوش و خروش کی پہلی منزل تخریب تھی اور یہی تخریب ان افسانوں میں نمایاں نظر آتی ہے۔

انگارے کے افسانوں میں جو نکالینے والی کیفیت ان کی بغاوت، بے باکی اور غصے میں ہے۔ کسی مصلحت اور اخلاقی ضابطے کا خیال رکھے بغیر تند و تلخ حقیقتوں سے پردہ اٹھانے کا جرات مندانہ عمل اس مجموعے کی پہچان ہے۔ تکنیک بھی نئی استعمال کی گئی ہے۔ زبان ناہموار ہے البتہ خود کلامی کا انداز نظر آتا ہے۔ ”انگارے“ نے اپنے عہد کی نئی نسل کی ترجمانی کی۔ ان افسانوں میں سنجیدگی کم اور غصہ زیادہ تھا یہ باغی نوجوانوں کی سوچ کا نیا زاویہ تھا جس کے تحت وہ معاشرے کو ایک نئی شکل دینا چاہتے تھے اور یہی سوچ ترقی پسند تحریک کی بنیاد بنی۔

اُردو افسانے کے اس عہد میں جدیدیت کا رجحان نمایاں ہوا۔ یہ دور برصغیر کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم دور تھا۔ پاکستان کے دو لخت ہونے کے باعث عام پاکستانی عدم شناخت اور پہچان کے گم ہو جانے کے مسئلے سے دوچار ہو چکا تھا۔ افسانے میں سماجی مسائل، جنسی و اخلاقی بے راہ روی اور انسان دوستی جیسے مسائل ماضی کا قصہ بن گئے اور پہچان کی گمشدگی، قنوطیت، زندگی کی لایعنیت، بے معنویت اور جبریت افسانے کا موضوع بنے۔

”پہچان کی گمشدگی“ اور عدم شناخت جیسے مسائل کا سانحہ ستوٹ مشرقی پاکستان کے بعد پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ یہ مسائل اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ایشیا اپنے مقامات سے ہٹ جائیں۔ پہچان کا کھوجانا ایک نئے سانحے کو جنم دیتا ہے جس میں فرد سب کچھ موجود ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ ہونے کا احساس لیے رہتا ہے۔ اس عہد میں یہ موضوعات غالب رجحان کی حیثیت سے ابھرے۔ اس دور میں عام آدمی کی زندگی معمول سے ہٹی ہوئی تھی اور وہ اپنی حیثیت کا تعین نہیں کر پاتا تھا۔

مرزا حامد بیگ اس عہد کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

”کراچی تادیلی اور دہلی تاڈھا کہ عوام کو دو بڑی عالمی طاقتوں کی باہمی کشاکش میں آگے کار کے طور پر برتا گیا۔ پھر بیوروکریسی کا گھناؤنا کردار، ہندو مسلم اور شیعہ سنی فسادات، سندھ کا خونیں تصادم، مشرقی بنگال میں فوجی ایکشن، بلوچستان اور سرحد میں سیاسی تناؤ... پھر ہم سب نے مشرقی بازو سے اکثریت کے ساتھ ابھر کر آنے والے شیخ مجیب الرحمن کو سلاخوں کے پیچھے دیکھا اور اس کے بعد زوال ڈھا کہ سب سے بڑھ کر یہ کہ پرانے عقائد اور نظریات کی چولیں ہل گئیں۔“ (۶)

پرانے عقائد اور نظریات کو تبدیل کر دینے والا یہ عہد فرد کی نفسیاتی کیفیات کو بھی تبدیل کر رہا تھا یہ دور رومان سے آنکھیں چرا کر تلخ حقائق سے آنکھیں ملانے کا وقت تھا۔ ادیب نے بھی ان کیفیات کو محسوس کیا۔ زوال ڈھا کہ سے قبل غلام محمد، مسعود اشعر، شاہد کامرانی، نور الہدیٰ سید، زین العابدین، ام عمارہ اور شہزاد منظر جیسے افسانہ نگار جو بنگال اور بنگالیوں کو سمجھتے تھے انھوں نے کافی عرصہ قبل ہی اس سانحے کی جانب اشارے دینے شروع کر دیے تھے۔

سانحہ ڈھا کہ کے بعد جدید افسانہ نگار یہ بات جان چکے تھے کہ وہ وقت کے ایسے چوراہے پر کھڑے ہیں جہاں ہر شے دھند میں چھپی ہوئی ہے۔ وہ یہ بھی جان چکے تھے کہ بیس سال قبل جو افسانہ مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ نئے منظر نامے میں اس فکر اور فن کی جگہ کہیں نہیں بنتی اب ان کے سامنے دور استے تھے۔ آسانی اختیار کر کے بیانیہ حقیقت نگاری کا پرتھامے رکھتے یا مشکلات کو گلے سے لگاتے اور پیچیدہ صورت حال کا بیان کرتے۔

سید شبیر شاہ ”گناہ کی مزدوری“ کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

”۶۸-۱۹۶۷ء تک آتے آتے ہم چیخ اٹھے اور فرسودگی فکر نئی نسل کے احتجاج کی زد میں آگئی۔ حوالے خواہ کچھ بھی ہوں لیکن ہمارے ادب میں زندگی کا رومانی پن اپنے ہی گلی کوچوں کے حوالے سے پھرا بھرنے لگا۔ جبر کی مشین اتنی زیادہ باصلاحیت تھی کہ یہ اہل زندگی کا حصہ تو نہ بن سکا لیکن اپنے پیچھے زندگی کی حرکت کا سرور چھوڑ گیا۔“ (۷)

اس عہد میں انتظار حسین کا افسانوی مجموعہ ”شہر افسوس“ (۱۹۷۲ء) شائع ہوا۔ ان کی اس مجموعے کی کہانیاں حقیقی اور ارضی مسائل کا احاطہ کرتی ہیں۔ عدم شناخت، کھوجانے کا خوف، لاعاصلی، بے معنویت اور زندگی کا لالچ یعنی بن ان کے افسانوں کے موضوعات تھے جو ساٹھ کی دہائی کے مارشل لا اور اس کے نتیجے میں زوال ڈھا کہ کا رد عمل بن کر ابھرتے ہیں۔ یہ افسانے اس عہد میں اس ماضی کی بازیافت کی کوشش تھی جو کہیں پیچھے رہ گیا تھا۔ سیاسی و سماجی توڑ پھوڑ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات کا بیان علامتی و استعاراتی سطح پر کیا گیا ہے۔ انتظار حسین نے اپنے عہد کے جبر و استحصال کو اس مجموعے میں بیان کیا ہے۔

۱۹۷۰ء میں شائع ہونے والے انور سجاد کے افسانوی مجموعے ”استعارے“ میں جدید علامتی انداز میں اپنے عہد کو بیان کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے جبر اور تہذیبی و معاشرتی کٹناؤ کو گالی دینے اور اس کے خلاف نعرہ لگانے کے بجائے ایک سنجیدہ فکر کے ذریعے اپنا پیغام پہنچایا ہے۔ وہ وجودی نظریات کے ذریعے اپنے عہد کے آشوب کو بیان کرتے ہیں۔ خارج کی حقیقت کو چھوئے بغیر وہ اپنے عہد کا بیان فرد کے داخلی تغیرات کے حوالے سے کرتے ہیں۔

خالدہ حسین جو ساٹھ کی دہائی میں اپنی پہچان بنا چکی تھیں، کا اڈولین افسانوی مجموعہ ”پہچان“ کے عنوان سے ۱۹۸۰ء میں طبع ہوا۔ اپنے ہونے یا نہ ہونے کا احساس اور ”میں“ کی تلاش ان کے افسانوں کے بنیادی موضوعات ہیں۔ فنی پختگی کے ساتھ وہ علامت اور استعارے کو استعمال میں لاتی ہیں۔ ان کے ہاں جدید علامتی افسانے کے تمام فنی لوازمات ملتے ہیں۔

ساٹھ کی دہائی میں اپنی پہچان جدید علامتی افسانہ نگار کے طور پر کروانے والے افسانہ نگاروں میں رشید امجد کا نام بھی شامل ہے۔ ان کے افسانوں کا موضوعاتی دائرہ جبر، عدم تحفظ، عدم شناخت، بے گانگی، بے معنویت اور فکری بانجھ پن کے حوالے سے بنتا ہے۔ اپنے سفر کی ابتدا میں ایوبی مارشل لا سے واسطہ پڑا اور پھر پے درپے سیاسی و سماجی گھٹن پیدا کرنے والے سانحات رشید امجد کے افسانوں کا منظر نامہ بنے۔ اس مارشل لا کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سیاسی گھٹن نے جمہوری آزادی کی تحریک کو پروان چڑھا یا تاہم جمہوری رویے پروان نہ چڑھ سکے۔ رشید امجد کے ہاں اسی سیاسی اور سماجی گھٹن کے کرب کو فرد کی داخلی نفسیات کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ اس علامتی پیش کش میں ذات کا کرب، تنہائی، وجود کی تلاش اور زندگی کے لغو رویوں کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ ستر کی دہائی کے افسانے میں قومی اتحاد کی تحریکیں ماور ضیاء الحقیق کا مارشل لا بھی ادیب کی داخلی نفسیات پر اثر انداز ہوا۔ اس تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی صورت حال نے افسانہ نگار کو نئے منظر نامہ ترتیب دینے پر مجبور کر دیا۔

مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

”پاکستان میں ۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۷ء فکری اور اظہاری سطح پر ایک کھلا پن (Open Ness) اور اس کے بعد زبان بندی دیکھی۔ رجعت پسند دھڑوں کا اتحاد، بحالی

جمہوریت کے لیے خود سوزی کی تحریک اور ۱۳ اپریل ۱۹۷۹ء کی پھانسی، یہ ریلیزم اور رومان کا انوکھا سنگم تھا۔ اس منظر نامے کو سمیٹنے کے لیے نئی تدبیر کاری، اسلوبیاتی سطح پر نئے تجربات اور لفظ کا نیا ورتار ہماری اہم ضرورتیں تھیں۔“ (۸)

سیاسی، سماجی، مذہبی، معاشرتی اور معاشی ہر سطح پر نئے راستوں کی تلاش ضروری تھی کیونکہ پچھلے راستے بند ہو چکے تھے۔ ستر کی دہائی کے افسانہ نگار نے اپنی آنکھ سے دنیا کو دیکھا اور پھر اس کو بیان کر دیا۔ ستر کی دہائی کے افسانے کی سب سے بڑی قوت پرانے تعصبات کا انہدام تھا یہ عمل افسانے کے نئے جنم کے مترادف تھا جس کے لیے طرز تحریر بھی مختلف ہونا ضروری تھا۔ ایسی حالت میں تمثیل علامت اور استعارے کو بنیاد بنایا گیا۔ آغاز میں یہ افسانہ ابہام کا شکار بھی ہوا اور جدید افسانہ نگار ذہنی اور تخلیقی سطح پر بے سمتی کا شکار ہوا۔ اس نے اپنا راستہ گم کر دیا ہے..... معلوم ہوتا ہے کہ علامت کو محض فیشن کے طوپر استعمال کیا جا رہا ہے جس میں نہ ذات ہے نہ عرفان ذات اور نہ اظہار ہے۔

جدیدیت کا رجحان ماضی کے مکمل رد کا رجحان نہیں تھا۔ ماضی کو ساتھ لے کر چلنے اور داستانی روایت سے رشتہ جوڑنے کی شعوری کوشش بھی کی گئی لیکن اس دہائی کے افسانے کا بنیادی منظر نامہ پاکستانی معاشرے کی سیاسی و سماجی شکست و ریخت سے ترتیب پاتا ہے۔ اسی کی دہائی میں افسانے پر پاکستان کے تیسرے مارشل لا کے خلاف احتجاج نظر آتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ جدید زندگی کی لایعنیت سے بیزاری کا اظہار بھی شامل ہے۔

انور سجاد کے افسانوی مجموعے ”آج“ (طبع اول: ۱۹۸۳ء) میں شامل افسانے ”دی آئیڈز آف مارچ“، ”نئی کوئیل“، ”ماں بیٹا“ اور ”سی گل“ اسی سیاسی جبر کے خلاف احتجاج ہیں۔ اسی کی دہائی میں مرزا حامد بیگ کا افسانوی مجموعہ ”گمشدہ کلمات“ منظر عام پر آیا (طبع اول: ۱۹۸۱ء) جس میں علامتی سطح پر مغل تہذیب کو بنیاد بنا کر ستر کی دہائی کے پاکستان کی منظر کشی کی گئی۔ افسانہ ”گمشدہ کلمات“ میں ایسی زبان بندی کا تذکرہ کیا گیا جو ستر کی دہائی کے آخر سے پاکستان کے مجبور عوام کا مقدر رہی اور گیارہ سال تک جاری رہی۔ یہ معاشرتی ٹوٹ پھوٹ فرد کی نفسیات میں خوف ناک دراڑیں ڈال رہی تھی جسے اس عہد کے افسانہ نگاروں نے محسوس کیا۔ خالدہ حسین کے ہاں نفسیاتی عدم تحفظ کے احساس کے ڈانڈے پھر اسی زبان بندی سے جا ملتے ہیں۔ نسوانی احساس عدم تحفظ اور تشکیک و اذیت کو سامنے لاتے ہوئے افسانے ”پرنہ“ اور ”ڈیڈ لیٹر“ ہیں۔

سب سے آج ہو جا بھی اسی دور میں ابھر کر سامنے آنے والا افسانہ نگار ہے جس کا پہلا افسانوی مجموعہ ”جنم + میں“ ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۶ء کی ہماری لہو میں لٹھری سیاسی اور سماجی تاریخ کا تجزیہ ان افسانوں کی بنیاد بنتا ہے۔ ان کا اسلوب کسی حد تک کھر دے اور اس اسلوب کے ساتھ تکنیک کا تامل میل ان کے افسانے میں معنی کے نئے دروا کرتا ہے۔

اس دور میں فکری سطح پر شکست و ریخت کا بیان تھا لیکن فنی سطح پر نئے تجربات کی کوشش بھی کی جا رہی تھی۔ ایسے افسانہ نگاروں میں رشید امجد، اعجاز راہی، احمد داؤد، منشا یاد اور مرزا حامد بیگ کے نام نمایاں ہیں۔ ان افسانہ نگاروں میں رشید امجد کا پہلا افسانوی مجموعہ ”بیزار آدم کے بیٹے“ (۱۹۷۳ء) میں شائع ہوا۔ اعجاز راہی کا افسانوی مجموعہ ”تیسری ہجرت“ (۱۹۷۳ء) میں، احمد داؤد کا افسانوی مجموعہ ”مفتوح ہوا میں“ (۱۹۸۰ء) میں شائع ہوا۔ مرزا حامد بیگ کا پہلا افسانوی مجموعہ ”گمشدہ کلمات“ (۱۹۸۱ء) اور دوسرا مجموعہ ”تار پر چلنے والی“ (۱۹۸۳ء) میں طبع ہوا۔ منشا یاد کا پہلا افسانوی مجموعہ ”بند مٹھی میں جگنو“ (۱۹۷۵ء) میں شائع ہوا جب کہ دوسرا مجموعہ ”ماس اور مٹی“ (۱۹۸۰ء) میں شائع ہوا۔ ان تمام افسانہ نگاروں نے فنی سطح پر نئے تجربات کیے اور بیانیہ کی گردن مروڑ کر شعر اور نثر کی حد بندیوں کو ختم کیا اور ایک نئی نثر کی بنیاد رکھی۔ زندگی کے بے معنویت اور معاشرتی بے حسی کو انھوں نے سیاسی و سماجی تناظر میں پیش کیا۔ منشا یاد کے ہاں دیہاتی معاشرے سے جڑے ہوئے مسائل کو پیش کیا گیا۔ اس عہد کی فکری اور نظریاتی محاذ آرائی افسانہ نگاروں کے ہاں بھی دیکھنے کو ملی۔ مظہر الاسلام، علی امام، اسلم سراج الدین اور ظہور الحق شیخ کے ہاں نظریاتی تغیرات کی فلسفیانہ توجیہات ملتی ہیں جب کہ انور سن رائے کے ہاں استعارہ سازی اور تکنیکی سطح پر مجرد کو تجسیم کرنے کا عمل ملتا ہے۔ اسد محمد خان ”کھڑکی بھر آسمان“، طبع اول ۱۹۸۲ء کے خالق ہیں۔ ان کے ہاں افسانہ نفسیاتی الجھنوں اور معاشرتی ناہمواریوں پر گہرے طنز کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

انور قمر، ذکاء الرحمن، علی تنہا اور سلام بن رزاق کے افسانوں میں فکر کے ساتھ زبان اور لہجہ طاقت ور ہے جو ان کے افسانے کی خصوصیت بن جاتا ہے۔ ان کے ہاں کردار بھی مضبوط ہیں تاہم انھوں نے نفسیاتی الجھنوں کا بیان بیانیہ اور شعور کی روکے مرکب کے ساتھ پیش کیا جو اُردو افسانے کا ایک علیحدہ آہنگ تھا۔ تمثیل نگاری اُردو افسانے میں ایک اہم اسلوب ہے اور ستر کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اس طرز میں نام بنایا ان میں شفیق، احمد جاوید اور علی حیدر ملک شامل ہیں۔ احمد جاوید کا اولین افسانوی مجموعہ ”غیر علامتی کہانی“ (طبع اول ۱۹۸۳ء) ہے اور علی حیدر ملک کا اولین افسانوی مجموعہ ”بے زمین، بے آسمان“ (۱۹۸۶ء) میں شائع ہوا۔ ان تمثیل نگاروں نے تاریخ کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی اور ماضی کی حقیقتوں کو عصری حقائق سے جوڑ دیا۔ ان کے ہاں داستانی آہنگ نمایاں ہے۔ علامتی اور تجریدی افسانے کے متوازی بیانیہ افسانے کی تحریک بھی چل رہی تھی۔ بیانیہ افسانہ نگاروں کے ہاں سماجی حقیقتیں، نفسیاتی الجھنیں اور معاشرتی ناہمواریوں کو مخصوص زاویہ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ نمایاں افسانہ نگاروں میں مشرف احمد، نجم الحسن رضوی، احمد یوسف، غلام محمد، نگہت حسین اور تقی حسین خسرو کے علاوہ مسرت لغاری، ضیاء اور نیلو فراہم شامل ہیں۔

اسی کی دہائی میں تجریدی، استعاراتی، تشبیہاتی اور علامتی افسانوں کے خلاف مضحکہ خیز رد عمل بھی سامنے آیا۔ عصمت چغتائی نے افسانہ نگاروں کا مضحکہ اڑانے کے لیے ”سانپ کے تلوے“ کے عنوان سے افسانہ لکھا اور طنز کے تیر برسائے۔ ممتاز مفتی نے بھی کچھ ایسا ہی کیا۔ تاہم سینئر افسانہ نگاروں نے جدید افسانہ نگاروں کے تتبع میں افسانہ بھی لکھا۔ ممتاز مفتی نے ”روغنی پتلے“ اور ”چکٹ گاڑی، ہونکتا ہوٹرا اور موم بتی“، اشفاق احمد نے ”بندر لوگ“، رحمن مذنب نے ”خوشبودار عورتیں“ اور بانو قدسیہ نے ”انتر ہوت اداسی“ لکھ کر جدید افسانے کے محل سرا میں قدم رکھا۔

”گواہی“ کے عنوان سے مارچ ۱۹۷۸ء میں چودہ افسانوں کا مجموعہ جسے اعجاز راہی نے مرتب کیا تھا شائع ہوا۔ اس مجموعے میں احمد جاوید، احمد داؤد، اعجاز راہی، انور سجاد، رشید امجد، مرزا حامد بیگ، منشا یاد اور مرزا حامد بیگ شامل تھے۔ ان افسانوں میں مارشل لا کی جبریت، سیاسی گھٹن اور معاشرتی بے حسی کے خلاف علامتی سطح پر احتجاج کیا گیا تھا۔

ستر کی دہائی میں ابھر کر سامنے آنے والے علامتی افسانہ نگاروں میں اعجاز راہی کا بھی نام شامل ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ۱۹۷۳ء میں ”تیسری ہجرت“ کے عنوان سے سامنے آیا۔ انھوں نے علامتی، تجریدی اور استعاراتی انداز میں معاشرے کے پسے ہوئے فرد کی عکاسی کی ہے۔ اعجاز راہی نے کم لکھا تاہم اُردو افسانے کو کئی عمدہ افسانے دیے۔

اسد محمد خان بھی جدید اُردو افسانے کا ایک اہم نام ہیں جن کا پہلا افسانوی مجموعہ ۱۹۸۰ء میں ”کھڑکی بھر آسمان“ کے عنوان سے شائع ہوا جس میں تیرہ افسانوں کے ساٹھ اڑتیس نظمیں بھی شامل ہیں۔ بعد میں ”برج خموشان“ (۱۹۹۱ء)، غصے کی نئی فصیل (۱۹۹۷ء)، پرندہ اور دوسری کہانیاں (۲۰۰۳ء) اور تیسرے پہر کی کہانیاں (۲۰۰۶ء) میں شامل ہیں۔

اسد محمد خان کا تخلیقی منطقہ مذہب اور تاریخ کے توازن سے تشکیل پاتا ہے۔ وہ اپنے عہد کی جبریت کو تاریخی تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ احمد جاوید کا تعلق بھی افسانہ نگاروں کے اسی قبیلے سے ہے جو ستر کی دہائی میں سامنے آئے۔ پہلا مجموعہ ”غیر علامتی کہانی“ کے افسانے جس اور جبر کے عصری ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ ”گمشدہ شہر کی داستان“ کی اہم بات فرد کی شناخت کی گم شدگی ہے۔ ان کے ہاں کون؟ کہاں؟ کیسے؟ کے سوالات جگہ جگہ اٹھائے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں مناظر ٹھوس بھی ہوتے ہیں اور سیال صورت میں بھی تاہم ان کا کافی اسلوب حذف، علامت، خط اور جملوں کے اختصار سے ترتیب پاتا ہے۔

انوار احمد ترقی پسند تحریک سے متاثر ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ ”ایک ہی کہانی“ کے عنوان سے ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا اور بعد میں ”پہلے سے سنی ہوئی کہانی“ کے عنوان سے (۲۰۰۳ء) میں اسی پہلے مجموعے کی اشاعت ہوئی۔ ان کے ہاں طبقاتی تقسیم اور معاشی و معاشرتی ناانصافی کا گہرا مطالعہ ملتا ہے۔ ان کے ہاں اجتماعی لاشعور پر بار بار دستک دی جاتی ہے۔ ایک فرد کی کہانی چند جملوں میں معاشرتی سطح پر اجتماعیت اختیار کر لیتی ہے۔ ہر ترقی پسند ادیب کی طرح انوار احمد کے ہاں بھی غصہ، مزاحمت،

احتجاج اور نفرت کے شدید رویے ملتے ہیں۔

احمد ہمیش افسانے میں جدیدیت کی داغ بیل ڈالنے والے افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ ”مکھی“ ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۹۸ء میں گیارہ افسانوں کا انتخاب ”کہانی مجھے لکھتی ہے“ کے عنوان سے کراچی سے شائع ہوا۔ ان کے ہاں ہندو اساطیری روایت اور دیومالا سے دلچسپی نظر آتی ہے۔ اسلامی فکر کے حوالے بھی وہ افسانوں میں لے کر آتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں اذیت، دکھ، ملال، غصہ، محرومی، احتجاج اور نفرت کی شدید کیفیات موجود ہیں۔ شعیب خالق نے ستر کی دہائی میں افسانہ لکھنا شروع کیا۔ ان کے ہاں بیانیہ اور علامتی دونوں اسالیب بیک وقت ملتے ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں پہلا افسانوی مجموعہ ”بے حرف لفظ“ کے نام سے شائع ہوا جس میں علامتی و استعاراتی انداز غالب ہے۔ ان کے زیادہ افسانوں میں جدید دور کے صنعتی مسائل کے شکار انسانوں کے مسائل زیر بحث ہیں۔ چند ایک افسانوں میں سائنس فکشن کو کہانی کی بنیاد بنایا گیا ہے۔

احمد اُد بھی جدید علامتی افسانہ نگار تھے۔ ان کے ہاں زندگی کے غیر معمولی رویے بنیاد بنتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں اپنے عہد کے سیاسی و سماجی اور تہذیبی جبر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ سیاسی جبر کے خلاف لکھے گئے افسانوں میں ”جواں مرگ کانوحہ“، ”خواب فروش“، ”نامہ بر“، ”شہید“ اور ”وہسکی“ اور ”پندرہ کا گوشت“ شامل ہیں۔

مظہر الاسلام کا نام جدید افسانے میں اعتماد اور فنی توازن کے باعث نمایاں ہے۔ وہ عصری میلانات کو مقدم رکھتے ہیں اور علامت اور تجرید کے ذریعے عصری رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ناصر بغدادی، انور زاہدی، علی حیدر ملک، محمود واحد، اے خیام، محمود احمد قاضی، سلیم آغا قزلباش اور آصف فرخی وہ افسانہ نگار ہیں جو اسی کی دہائی میں متعارف ہوئے۔

ناصر بغدادی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ”بے شناخت“ (۱۹۹۰ء) دوسرا مجموعہ ”مصلوب“ (۲۰۰۴ء) میں شائع ہوا۔ تشکیک ان کے افسانوں کا بنیادی رویہ ہے۔ وہ اپنا اسلوب بیانیہ اور علامت کے مرکب سے حاصل کرتے ہیں۔

انور زاہدی کا پہلا افسانوی مجموعہ ”عذاب شہر پناہ“ (۱۹۹۱ء) اور ”موسم جنگ کا کہانی محبت کی“ (۱۹۹۷ء) میں شائع ہوئے۔ وہ جدیدیت کی طرف مائل افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کا خصوصی حوالہ جدید انسان کو درپیش مسائل ہیں۔

علی حیدر ملک کے ہاں انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ ملتا ہے۔ وہ ظلم اور جبر کے خلاف ایک شدید احتجاجی رویہ بھی رکھتے ہیں اور قدروں کی پامالی پر دکھ اور رنج بھی ان کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔

”موسم کا میسا“ (۱۹۸۸ء) محمود واحد کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ دوسرا مجموعہ ”لمحہ زندگی“ ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ ان کی کہانیاں جدید عہد میں فرد کے ریزہ ریزہ ہونے کی داستان بیان کرتی ہیں جس میں خوف اور وحشت دو کلیدی استعارے بن کر ابھرتے ہیں۔

اے خیام کے افسانے صنعتی سائنسی تیز رفتاری میں فرد کی گمشدگی کی کہانیاں ہیں۔ کاڈکا سے متاثر ہونے کے سبب ان کے ہاں بھی اکثر کردار قلب ماہیت سے گزرتے ہیں۔ ان کے افسانے لمحہ موجود کے افسانے ہیں۔

زاہدہ حنا کی شہرت پہلے افسانوی مجموعے ”زیتون کی شاخ“ سے ہوئی جو برصغیر کے تہذیبی پس منظر کا تجزیہ ہے۔ بعد میں ”قیدی سانس لیتا ہے“ اور ”راہیں اجل ہے“ شائع ہوئے جو ان کی جدت پسندی کا بھرپور اظہار ہیں۔

محمود احمد قاضی افسانہ نگاری میں ایک واضح نظریاتی اساس رکھتے ہیں۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے ”ہوا“ کے افسانوں کا اسلوب بیانیہ ہے لیکن دوسرے مجموعے ”ٹھہرا ہوا موسم“ میں جدید علامتی و تمثیلی انداز نمایاں ہے۔ وہ جبر کی فضا میں انسان کی بے تو قیری کی کہانی بیان کرتے ہیں۔

آصف فرخی واقعے سے زیادہ تاثر کو اہمیت دینے والے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے ”آتش فشاں پر کھلے گلاب“، ”اسم اعظم کی تلاش“، ”شہر

بتی، ”شہر ماجرا“ اور ”ایک آدمی کی کمی“ کی کہانیوں میں فرد کی بے بسی کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ ان کے ہاں مشاہدہ فکری تنوع سے ہم آہنگ ہو کر ہر واقعے کو آفاقی سطح پر پھیلا دیتا ہے۔ وہ زندگی میں پیش آنے والے روزمرہ مسائل، اندیشوں، واہموں، افواہوں اور وحشت و بربریت کی علامتی تصویریں بناتے ہیں۔ سلیم آغا قزلباش کے افسانوں کا مجموعہ ”انگور کی تیل“ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ سلیم آغا اپنے عہد کے آشوب کو بیان کرتے ہیں۔ ان کا دوسرا مجموعہ ۱۹۹۵ء میں ”صبح ہونے تک“ کے عنوان سے شائع ہوا۔ ان کے افسانوں میں عصری علوم کا مطالعہ اور جدید دور کے انسان کے سماجی رویوں کی عکاسی ہوتی ہے۔ مبین مرزا، محمد حمید شاہد اور حامد سراج نوے کی دہائی اور اس کے بعد اپنا نام بنانے والے افسانہ نگار ہیں۔ مبین مرزا کا پہلا افسانوی مجموعہ ”خوف کے آسمان تلے“ ۲۰۰۲ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ ان کے افسانوں میں جبر، وحشت اور خوف کی فضا موجود ہے جو جدید زندگی میں انسان کا مقدر ہے۔ انھوں نے اپنا افسانوی لینڈ سکیپ کراچی کی شہری زندگی سے تعبیر کیا ہے۔

محمد حمید شاہد کا پہلا افسانوی مجموعہ ”بند آنکھوں سے پرے“ ۱۹۹۳ء اور دوسرا ”جنم جنم“ کے نام سے ۱۹۹۸ء اور تیسرا ”مرگ زار“ کے عنوان سے ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔

ان کے افسانوں میں فکر، تجسس اور تاثر اکٹھے ہو کر سامنے آتے ہیں۔ بیانیہ اور علامتی دونوں اسالیب میں افسانے لکھتے ہیں۔ انکے ہاں جذباتیت سے اجتناب ہے اور ایک تاثر انگیز سنجیدگی نمایاں نظر آتی ہے۔

ان افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ رضیہ فصیح احمد، عرش صدیقی، انور نسیم، فرخندہ لودھی، مسعود مفتی، اکرام اللہ، وقار بن الہی، شہزاد منظر، یونس جاوید، امر اوطار، محمد سعید شیخ، جاوید اختر بھٹی اور آغا گل ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے ستر کی دہائی یا اس کے بعد افسانے کے فن میں اپنا نام بنایا۔

اُردو افسانہ ستر کی دہائی کے بعد فکری اور فنی ہر دو سطحوں پر اپنا الگ راستہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ علامت اور تجرید کو قاری نے قبول کیا اور بیانیہ کے نئے اسالیب کی دریافت بھی ممکن ہوئی۔

اُردو افسانہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز میں اس وقت ہوا جب مغربی افسانہ ہمارے ہاں ترجمہ ہونا شروع ہو چکا تھا۔ اس دور میں ہمارے افسانہ نگار براہ راست انگریزی افسانوں کا مطالعہ کر رہے تھے اور مغربی افسانے میں حقیقت واقعہ اور کردار کی پیش کش کے طریقے سے واقف ہو رہے تھے۔ آغاز میں طبع زاد افسانے سے زیادہ مغربی افسانے کے تراجم کیے گئے۔ ہمارے افسانہ نگار کے ہاں فکر کی بنیاد برصغیر کا داستانی نظام ہی تھا تاہم ہمارے افسانہ نگار کو تکنیک کا شعوری احساس مغربی ادب سے ہوا۔

مرزا حامد بیگ نے کہا تھا:

”ہمارا افسانہ گوگول کے اور کوٹ سے برآمد نہیں ہوا۔“^(۹)

ان کا یہ جملہ اُردو افسانے کی فکری ساخت کا تعلق ہمارے اپنے سماج سے جوڑتا ہے تاہم افسانہ میں مختلف تکنیکوں کا استعمال غیر ملکی ادب سے مستعار ہے۔ اُردو افسانے پر مغربی اثرات کا آغاز سرسید کی ادبی تحریک سے ہی ہو گیا تھا۔ حالی اور آزاد نے جدید شاعری کا ڈول ڈالا اور غزل کے طرحی مشاعروں کے توڑ کے طور پر موضوعاتی نظموں کے مشاعرے منعقد کروائے۔ مغربی اثر کے تحت ہماری روایتی شاعری میں ایک نیا آہنگ پیدا ہوا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے انگریزی ناول سے متاثر ہو کر اُردو میں ناول نگاری کا آغاز کیا جس میں بعض اوقات داستانی انداز بھی اختیار کیا خاص طور پر کرداروں کا اسم با مسمی ہونا سی حکایت اور داستان کی یاد دلاتا تھا۔ ابتدائی طور پر افسانہ نگاری بھی داستان سے متاثر ہوئی تاہم بعد کے افسانہ نگاروں پر مغربی افسانے کے اثرات نظر آنے لگے۔

ڈاکٹر فوزیہ اسلم لکھتی ہیں:

”ابتدائی افسانہ نگاروں نے کچھ داستانوں کے فن سے متاثر ہو کر اور کچھ نے قدیم کہانیوں کے اثر کے تحت قومی اور رومانی افسانے لکھے لیکن مغربی افسانے کے اثرات

اُردو افسانے میں اس وقت سے داخل ہونے شروع ہوئے جب سے نیاز فتح پوری اور آگے چل کر محمد مجیب، خواجہ منظور حسین، جلیل قدوائی اور منصور احمد وغیرہ نے زیادہ تر وہی افسانے کے ترجمے کیے اور ان کے رنگ میں طبع زاد افسانے لکھے۔“ (۱۰)

افسانے کے آغاز میں بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں افسانہ نگار مغربی تراجم کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان مترجمین میں جلیل قدوائی، حامد علی خان، محشر بدایونی، فضل حق قریشی، اختر حسین رائے پوری، مجنوں گور کھیوری، قاضی عبدالغفار اور اعظم کرپوی کے نام نمایاں ہیں۔ ان مترجمین میں خواجہ منظور حسین اور جلیل قدوائی کے ہاں روسی افسانہ نگاروں کا رنگ نظر آتا ہے۔

پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

”خواجہ منظور حسین اور جلیل قدوائی نے روسی افسانہ نویس چیخوف کے یہاں سے، اعظم کرپوی نے ہندی اور دوسرے لکھنے والوں نے مختلف زبانوں سے افسانے لیے اور باقاعدہ ترجمے کیے۔ مجنوں نے لفظی ترجمے کرنے کے بجائے انگریزی کہانیوں اور خاص کر ہارڈی کی کہانیوں پر اپنے افسانے ڈھال لیے۔“ (۱۱)

تراجم کے اثرات اس دور کے نوجوان افسانہ نگاروں پر نمایاں ہونے لگے۔ تیسری دہائی کے آخر میں یہ مغربی اثرات اُردو طبع زاد افسانے پر نظر آنے لگے۔ موپساں کے اثرات منٹو کی صورت میں افسانے پر ظاہر ہوئے اور چیخوف کا اثر بیدی کی صورت میں سامنے آیا۔

ہمارے افسانوں میں مغربی اثرات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ان اثرات کا آغاز پریم چند کے افسانوں سے ہوا تاہم ۱۹۳۱ء کے بعد یہ اثر واضح ہوا جب مغربی دنیا کے تعلیم یافتہ افسانہ نگار واپس ہندوستان آئے۔ آغاز سجاد ظہیر نے کیا اور ”لندن کی ایک رات“ اس کی نمایاں مثال ہے۔ یہ ایک ایسے ہندوستانی طالب علم کی کہانی ہے جو تعلیم حاصل کرنے لندن گیا ہے۔ ایک مختلف معاشرے میں رہنے سے اس کے ذہن، کردار اور شخصیت پر پڑنے والے اثرات کا مطالعہ اس کا موضوع ہے۔ آغاز میں ایسے افسانے لکھنے والوں میں زیادہ تر انگریزی زبان جاننے والے تھے اور یہ لوگ اپنی روایات کے مقابلے میں مغربی روایات سے زیادہ واقف تھے۔ مغرب میں اس زمانے میں افسانہ نگاری پر دو نام تحریکوں کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ ایک موپساں اور دوسرا چیخوف، موپساں کے ہاں نشیبت ہے جب کہ چیخوف کے ہاں تاثیریت اور آہستہ روی ہے۔ ان کے علاوہ بھی ہمارے افسانے پر کافکا، آلدوس ہکسلے، ورجینیا وولف اور ڈی۔ ایچ لارنس کا براہ راست اثر دیکھا جاسکتا ہے۔ مرزا حامد بیگ کے خیال میں جدید افسانے پر کافکا کے اثرات سب سے نمایاں ہیں۔

وہ لکھتے ہیں:

”ہمارے افسانہ گوگول کے اور کوٹ سے برآمد نہیں ہوا۔ اس کے فکری سوتے ہمارے اپنے ہیں البتہ مغربی افسانہ ہمارے کہانی کے لیے ہم عصر تناظر ضرور رہا۔ یہ ہم عصر تناظر ہماری سپلائی لائن کو نئے تقاضوں کی سرحد تک لاکھڑا کرتا ہے۔“ (۱۲)

۱۹۳۰ء کے بعد افسانے پر چیخوف اور موپساں کے اثرات تو نمایاں تھے ہی تاہم بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں فرائیڈ کے نظریات نے پوری دنیا کے دانش ور طبقے کو متاثر کیا۔ فرائیڈ نے شخصیت کے ان گوشوں کو بھی کھگانے کی کوشش کی جہاں تک اس سے پہلے کسی کی نظر نہ گئی تھی۔ افسانے کو شعور کی رواد اور آزاد تلامذہ خیال جیسی تکنیکیں ملیں۔ بات کہنے کے نئے ڈھنگ مل گئے اور افسانہ نگار انسانی شخصیت کے اندر جھانکنے اور تبصرہ کرنے کے قابل ہو گیا۔ اس کے سامنے شعور، تحت الشعور اور لاشعور کے تاریک گوشے بے نقاب ہوئے۔

سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

”افسانوی ادب پر کئی چیزیں نمایاں طور پر اثر انداز نظر آرہی ہیں۔ جو اُس اور پرست کا نفسیاتی فن، شعور کی رو کا نظریہ، لارنس کی دکھائی ہوئی جنسی زندگی اور جینا وولف کی مادی زندگی کے خلاف بغاوت، ہکسلے کا فلسفہ، چیخوف کا انسانی محبت کا عالمگیر جذبہ، فرائیڈ کی جنسی نفسیات، مارکس کا معاشی نقطہ نظر ان سب چیزوں نے مل کر ہمارے افسانوی ادب میں ایک ایسی بوقلمونی پیدا کی جو خوش آئند ہے۔“ (۱۳)

فرائیڈ کے نظریات نے ادب کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ غزل، نظم اور شاعری کی دوسری اصناف پر بھی یہ اثرات نظر آئے تاہم افسانہ اس سے سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ بیسویں صدی میں سائنسی نظریات نے انسانی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں انسان کی داخلی کیفیات کو سمجھنے کے سلسلے میں بھی کام ہوا۔ سگمنڈ فرائیڈ کے بعد یونگ نے بھی انسانی نفسیات کے علم کو سائنسی بنیادوں پر پھیلا یا۔ شعور کی رواج نفسیات کے علم سے اخذ کردہ افسانوی تکنیک ہے جس کے ذریعے افسانے میں کرداروں کی ذہنی، نفسیاتی اور جذباتی زندگی کی کشاکش کو سامنے لایا جاتا ہے۔ شعور کی روکی تکنیک میں لکھی جانے والی فکشن میں بظاہر ایک بے ترتیبی نظر آتی ہے تاہم اس کی اندرونی سطح پر ایک نظم یا ترتیب موجود ہوتی ہے۔ اس ترتیب اور تنظیم کو سمجھنے کے لیے زیرک نگاہی اور باریک بینی کی ضرورت ہوتی ہے۔ علم نفسیات نے مغربی افسانہ نگاروں لارنس، مارشل پروست، فلائیٹر، موپاساں، زولا اور جیمس جونس کے فن پر نہایت اہم اثرات مرتب کیے اور ان کے ذریعے یہ اثرات ہمارے افسانہ نگاروں تک بھی پہنچے۔

اُردو افسانے میں نفسیات کے ساتھ جنس کا تصور بھی فرائیڈ کے زیر اثر پیدا ہوا۔ انکارے کے افسانے اس کی مثال ہیں۔ اُردو افسانہ فرائیڈین نفسیات کے زیر اثر سماج کے فرسودہ معیارات کو مسماہ کرنے کی کوشش کرتا رہا اور جنس، جنسی بھوک، جنسی تسکین اور جنسی تھکن جیسے موضوعات کے ذریعے انسانی زندگی کے تاریک گوشوں کو اجاگر کرتا رہا۔ ”انکارے“ اور ”شعلے“ کے بعد جنسی موضوعات عصمت، منٹو، محمد حسن عسکری، عزیز احمد، ممتاز مفتی اور آغا بابر تک آپہنچے۔ ان سب افسانہ نگاروں پر فرائیڈ کے اثرات نمایاں ہیں۔ کردار کی داخلی نفسیات کے حوالے سے منٹو، عصمت، احمد علی، بیدی، غلام عباس اور قرۃ العین حیدر نے کام کیا۔ اُردو افسانے میں مغربی اثرات سب سے پہلے احمد علی کے ہاں ظاہر ہوئے۔ سر نیلزم کی تحریک کے زیر اثر خواب بیداری کی کیفیت، شعور کی رواج آزاد تلامذہ خیال جیسی تکنیکیں ان کے افسانوں میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ اظہاریت، رمزیت اور علامت کا استعمال بھی ان کے افسانوں میں اول اول نظر آیا۔ جدید مغربی اثرات سے مزین افسانوں میں ”میراکرہ“، ”قید خانہ“، ”موت سے پہلے“ اور ”ہماری گلی“ شامل ہیں جن میں علامت اور استعارے سے کام لیا گیا ہے۔ منٹو کے ہاں بھی مغربی افسانے کے اثرات نمایاں ہیں۔ جنسی موضوعات پر افسانہ لکھتے ہوئے وہ علامت اور رمز کو استعمال کرتے ہیں۔ ان کے ہاں جنسی نفسیات کا گہرا مطالعہ ملتا ہے۔ وہ جنسیات کے حوالے سے لارنس سے اثر قبول کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ملک حسن اختر لکھتے ہیں:

”جنسی موضوعات کے سلسلے میں منٹو ڈی۔ ایچ۔ لارنس سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہے۔ اگرچہ اس کے ہاں اتنی کھلی عربیاتی نہیں جو لارنس کے ہاں ہے مگر وہ اپنے افسانوں میں وہ بیان کر جاتا ہے جو زیادہ سے زیادہ ایک ہندوستانی یا پاکستانی بیان کر سکتا ہے۔“ (۱۳)

منٹو کی فنی مماثلت موپاساں سے ہے۔ دونوں کے ہاں زبان کے تیور کڑے ہیں۔ منٹو کے کردار ہندوستانی تہذیب و ثقافت سے کشید شدہ ہیں۔ لہذا اس کے کردار فنی لحاظ سے پختہ ہیں۔ منٹو پر مغرب کی ادبی اور سماجی تحریکوں کے اثرات پڑتے رہے ہیں۔ ایک مختلف اور آزاد مزاج کے افسانہ نگار ہونے کے باعث اس کے ہاں جدید تکنیک اور نئے اسلوب کے تجربات بھی ملتے ہیں۔ اس کے علامتی انداز فکر کے ترجمان افسانے ”پھندنے“، ”کالی کلی“ اور ”فرشتہ“ کے ہیں جن میں علامت، استعارہ اور شعور کی رو کا استعمال نظر آتا ہے۔

منٹو پر فرائیڈ کی نفسیاتی تحریک کے مثبت اثرات بھی پڑے۔ وہ انسانی نفسیات کا گہرا نباض ہے۔ اس کے ہاں نفسیاتی شعور حقائق کا ترجمان بن کر سامنے آتا ہے وہ نفسیاتی پیچیدگیوں کی پرتیں تہہ در تہہ کھولتا ہے۔ دھواں، خوشیا، بو، بلاؤز، ہنک اور کالی شلوار جیسے افسانوں میں انسانی نفسیاتی تغیرات کو بہت موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اُردو افسانے میں روسی ادب کے اثرات سے زیادہ کرشن چندر کے افسانوں پر پڑے۔ چیخوف وہ افسانہ نگار تھا جس کی حقیقت نگاری اُردو افسانے میں باقاعدہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔ کرشن چندر کا افسانہ ”حسن اور حیوان“ بے باک حقیقت نگاری کی مثال ہے اور اسے چیخوف کے افسانے ”steppe“ سے مشابہہ بھی قرار دیا گیا۔ کرشن چندر نے ایڈرگراہیلن پو، کافکا اور موپاساں کے انداز میں افسانوی تجربات بھی کیے۔ تاہم کرشن چندر پر سمرسٹ ماہم کے اثرات سب سے زیادہ

پڑے۔ سید احتشام حسین نے کرشن چندر کے حوالے سے ایک جگہ لکھا ہے:

”کنٹیک ان کے ہاتھ میں گیلی مٹی کی طرح ہے جسے وہ اپنی غیر معمولی فنی ادراک کی مدد سے حسین سانچوں میں ڈھال سکتے ہیں۔“ (۱۵)

محمد حسن عسکری کے ہاں داخلی کیفیات کی عکاسی یعنی سرریلیزم، وجودیت، حقیقت نگاری، علامت فرائیڈ اور مارکس کے نظریات کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ تاہم ان کے ہاں کوئی بھی رجحان نمایاں ہو کر سامنے نہیں آتا ہے۔ ان کے ہاں والیٹر، موپساں، فرانس اور استاں دال کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ”چائے کی پیالی“ اور ”حرا بادی“ ان کے نمایاں افسانے ہیں۔ بیدی کے ہاں گہرائفیاتی شعور ملتا ہے۔ وہ ایک حقیقت نگار تھے اور ان کے فن پر روسی اور فرانسسی حقیقت نگاروں کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ٹالسٹائی، رگنیف، چیخوف، گورکی، موپساں، ورجینا وولف، لارنس، برٹ ہارٹ، چندر چوڑھی اور نیگلور کی حقیقت نگاری نے لاشعوری سطح پر بیدی کے فن پر اثر ڈالا۔ ”رحمان کے جوتے“، ”غلامی“، ”ہڈیاں اور پھول“ اور ”لاروے“ ایسے ہی افسانے ہیں جن پر مغربی تحریکوں کے اثرات موجود ہیں۔ عصمت چغتائی بھی فرائیڈ کی نفسیاتی تحریک سے متاثر تھیں۔ عورتوں کی نفسیات اور خاص طور پر خاندانی نظام کے حوالے سے ان کے ہاں گہرا مشاہدہ ملتا ہے۔ جنسی نفسیات کا بیان بھی وہ بہت مہارت سے کرتی ہیں اور ایسے افسانوں میں علامت نگاری بھی نظر آتی ہے۔ مشہور افسانوں میں ”لحاف“، ”چھوٹی آپا“، ”بھول بھلیاں“، ”جنائے“ اور ”پردے کے پیچھے“ شامل ہیں۔

عزیز احمد بھی اُردو افسانے کا ایسا نام ہیں جو مغربی افسانہ نگاروں سے متاثر ہوئے۔ وہ مغربی ادب کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے تھے اور مغربی تحریک اور رجحانات سے واقف تھے۔ انھوں نے کبلسے سے براہ راست اثر قبول کیا۔ ان کے ہاں فرانسسی جنس نگاروں کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ اہم افسانوں میں ”مدن سینا اور صدیاں“، ”زریر تاج“ اور ”تصور شیخ“ شامل ہیں۔

ممتاز شیریں بھی ایسی ہی افسانہ نگار ہیں جن پر مغربی افسانے کے اثرات نمایاں ہیں۔ وہ علم نفسیات سے واقف تھیں اور مغربی ادبی تحریکوں پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ”انگڑائی“ اور ”آئینہ“ اہم افسانے ہیں۔

قرۃ العین حیدر وہ افسانہ نگار ہیں جن کے توسط سے ہنری جیمز، رچرڈ سن اور ورجینا وولف کے اسلوب اور کنٹیک کو اُردو میں برتا گیا۔ وہ شعوری سطح پر ورجینا وولف سے بہت متاثر تھیں ان کے ہاں رومانویت، تاریخی شعور، شعور کی رو، آزاد تلازمہ خیال کو افسانوں میں استعمال کیا گیا۔ اہم افسانوں میں ”قص شرر“ اور ”ستاروں سے آگے“ شامل ہیں۔

ممتاز مفتی کے ہاں بھی مغربی افسانہ نگاروں کے اثرات نظر آتے ہیں۔ انھوں نے فرانسسی انگریزی، امریکی اور روسی ادب کا بطور خاص مطالعہ کیا۔ ان کے ہاں فرائیڈین انداز فکر نمایاں ہے۔ ان کے ہاں نفسیاتی مطالعہ انفرادی سے اجتماعی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ اہم افسانوں میں ”آپا“، ”محلہ“، ”اوئی اللہ“ اور ”پل“ شامل ہیں۔

ساٹھ کی دہائی کے بعد جب افسانے میں علامت اور استعارے کا شعوری استعمال شروع ہوا تو تقریباً تمام اہم افسانہ نگاروں نے مغربی افسانہ نگاروں کا تتبع کیا۔ یہ تتبع فنی سطح پر تھا جب کہ فکری نظام اسی سماج سے متعلق تھا۔ رشید امجد، انور سجاد، منشا یاد، مرزا حامد بیگ، سمیع آہو جا اور مظہر الاسلام کے ہاں یہ مغربی اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

References

1. Artaza Kareem, Dr., Urdu Function Ki Tanqeed, Dehli University, Dehli, Aug. 1997, p.29
2. Nighat Rehana Khan, Dr., Urdu Mukhtasar Afsana: Funni-o-Takneeky Mutala, Bookwise, Lahore, 1998, p. 50.
3. Mirza Hamid Baig, Dr., Urdu Afsanay ki Riwayat, Dost Publication, Islamabad, 2010, p 79.
4. Mirza Hamid Baig, Dr., Urdu Afsanay ki Riwayat, p 79.
5. Anwar Sadeed, Dr., Urdu Adb ki Tahreeken, Anjman Tarraqi -a-Urdu, Karchi, 1991, p 465.

6. Mirza Hamid Baig, Dr., Urdu Adb Ki Shanakht, Orient Publishers, Lahore, 2007, p. 47.
7. Mirza Hamid Baig, Dr., Gunah Ki Mazdoori (Afsanvi Majmoah), Safina Iblagh, Islamabad, Sep. 1991, p.19.
8. Sawal Ya Hay, (Muratibba) Noshi Anjum, Beacon Books, Multan, 2002, p.211-213.
9. Fozia Aslam, Dr., Urdu Afsanay Main Asloob Aur Tacneek Kay Tajrubat, Poorab Academy, Islamabad, 2007, p.240.
10. Fozia Aslam, Dr., Urdu Afsanay Main Asloob Aur Tacneek Kay Tajrubat, p. 181-182.
11. Ahtsham Hussian, Ifkar-o-Masail, Nusrat Publication, Lucknou, (India), April 1963, p.33.
12. Mirza Hamid Baig, Dr., Afsanay Ka Manzar Nama, Maktaba Aalia, Lahore, 2end Edition, 1982, p.16.
13. Waqar Azeem, Syed, Nia Afsana, Urdu Academy, Karachi, 1957, p.38.
14. Akhtar Hassan, Malik, Dr., Tareekh-a-Adb Urdu, University Book Agency, Lahore, p.68.
15. Musharaf Ahmad, Krishan Chandar Ka Tanqeedi Mutala, Nafees Academy, Karachi, Add. I, January 1988, p. 113.